پروفیسر رشید احمد

قرآنی نظریۂ مملکت

چھٹی صدی عیسوی تاریخ انسانیت کا بدترین عہد ہے۔ ثقافتی اور تمدنی ترقیوں سے ہمکنار ہونے کے باوجود انسان خود فراموشی اور خدا فروشی کا شکار ہو گیا۔ ایران مجوسیت کی آڑ میں سراپا شرک میں غرق تھا۔ سلطنتِ روما مسیحی تعلیمات کی علمبرداری کے باوجود مشرکانہ عقائد میں کسی سے پیچھے نہ تھی۔ حتیٰ کہ رحمت و رافت کے مبلغ کی اُمّت نے بہیمیت اور درندگی کو اپنا شیوہ بنالیا اور خونریزی ان کا محبوب ترین مشغلہ بن گیا۔ مذہب کے نام پر خون کی ندیاں بہا دینے میں انہیں کسی قسم کا عار نہ تھا۔ چین نے مردہ پرستی اور گور پرستی اختیار کر لی۔ جن اور بھوت ان کے خدا بن بیٹھے۔ ہندوستان ضلالت اور گمراہی میں اپنی نظیر آپ تھا۔ عرب میں قتل و غارت گری، خونریزی و سفاکی کا دور دورہ تھا۔ قبیلہ کے باہر ہمدردی اور بھائی چارگی نام و نشان کو نہ تھی۔ پورے ملک میں لاقانونیت ہی کی حکومت تھی۔ خدا کا گھر بتوں کا اڈا بنا ہوا تھا۔ ان حالات میں انسانی ہدایت کے لیے خدا کا آخری پیغام ـــــ قرآن مجید ـــــ نازل ہوا۔ جس کے مخاطبین اوّلین اگرچہ اہل عرب تھے لیکن قیامت تک کے لیے پوری دنیا کی ہدایت کے لیے اترا جس میں دینی اور دنیوی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے کہ رہنمائی نہ کی گئی ہو۔ مذہبی، سیاسی، سماجی اور معاشی غرضیکہ کوئی ایسا میدان نہیں ہے جس کے بارے میں اس سرچشمۂ رشد و ہدایت نے ہدایات نہ دی ہوں۔

لفظ قرآن قرأت سے مشتق ہے جس کے لفظی معنی ہیں وہ چیز جو پڑھی جائے۔ اسی معنی میں یہ لفظ خود قرآن حکیم میں مستعمل ہے۔ ان علینا جمعہٗ وقرانہٗ (اس کا جمع کرا دینا اور پڑھا دینا ہمارے ذمہ ہے)۔ سعدی شیرازیؒ نے بھی قرآن کو پڑھنے ہی کے معنی میں استعمال کیا ہے:

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست ‌ ‌ ‌ ‌ کتب خانہ چند ملت بشست

قرآن کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ کتاب دقیق معانی اور عمیق اسرار کی حامل ہے جن تک بغیر غور و تدبّر کے رسائی ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اس کا بار بار مطالبہ کیا گیا ہے اور فرمایا ہے افلاتدبرون

فی القرآن (تم قرآن حکیم کی آیات میں غور و خوض کیوں نہیں کرتے ہو) اور ظاہر ہے کہ یہ غور و خوض بغیر بار بار پڑھے ممکن نہیں اس لیے فاقرءوا ما تیسر منہ (قرآن حکیم میں سے جو حصہ تمہیں میسر آئے اسے پڑھا کرو) فرمایا ہے۔ اس لیے اس کتاب کے لیے القرآن سے بہتر اور کوئی نام نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دیگر کتبِ سماویہ لکھی لکھائی نازل ہو گئیں لیکن قرآن مجید حضرت جبرئیل علیہ السلام کی وساطت سے رسول کریم صلعم کو پڑھایا گیا سنقرءك فلا تنسیٰ (ہم آپ کو اس طرح پڑھائیں گے کہ آپ بھول نہ سکیں گے) پھر اس کتاب کا سب سے پہلا لفظ جو نازل ہوا تھا وہ اقراء تھا۔ اس لیے قرآن ہی اس کا موزوں ترین نام ہو سکتا تھا۔

یہ کتاب دیگر آسمانی کتابوں کی طرح یک مشت نازل نہیں ہوئی بلکہ تیئیس سال تک تھوڑی تھوڑی نازل ہوتی رہی۔ جس سے مقصد یہ تھا کہ صدیوں کے گم کردہ راہ انسان کو انقلاب آفریں درس بتدریج دیا جائے تاکہ اس کی ہدایات کو ذہن نشین کرنے اور اس کی تہ تک پہنچنے کا اسے موقعہ مل سکے۔ اتنا زبردست نظامِ حیات یکبارگی لوگوں کے سامنے پیش کر دیا جاتا تو لوگ اس کی پابندی کرنے اور اس کو سمجھنے سے قاصر رہتے۔ پھر تعلیم زیادہ موثر اس وقت ہوتی ہے جب کہ موقع و محل کے اعتبار سے تعلیم دی جائے ایسی صورت میں جب کہ حکم کا خاص موقعہ ہو حکم دینا ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اوامر و نواہی کی ایک طویل فہرست ایک مرتبہ ہی بغیر ضرورت و موقعہ کے دیدی جائے تو انسان اسے زیادہ درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنی آیات حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت نازل ہوتی رہیں اور الہامی طور سے ان آیتوں کی ترتیب عمل میں آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت یہ کتاب ہڈیوں، کپڑوں، تختیوں اور پتوں پر لکھی ہوئی تھی۔ اور بے شمار لوگ اس کے حافظ تھے۔ عہد صدیقی میں فتنۂ ارتداد کی سرکوبی کے سلسلے میں جنگ یمامہ پیش آئی جس میں تقریباً سات سو حفاظِ قرآن شہید ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے بہت اصرار کے بعد حضرت صدیقؓ کو جمع قرآن پر آمادہ کیا اور یہ خدمت مشہور صحابی زید بن ثابت کے سپرد کی گئی۔ انہوں نے کتابی شکل میں جمع کر لیا۔ عہد عثمانی میں مسلمانوں کے اختلافِ قرأت اور ان میں سے ہر ایک کو اپنی قرأت کی صحت پر اصرار کے پیش نظر اس صدیقی نسخے کی بہت سی نقلیں کروائی گئیں اور تمام صوبوں کے صدر مقامات میں تقسیم کر دی گئیں اور حکم دیا گیا کہ لوگ اسی کے مطابق تلاوت کریں۔

قرآن مجید کی کتابت پہلے حمیری رسم الخط میں ہوئی، پھر کوفی، پھر بغدادی میں، ابتدا میں حروف پر نہ تو نقطے تھے اور نہ ہی اعراب۔ یہ اہم خدمت نصر بن عاصم نے حجاج بن یوسف کے ایما پر انجام دی۔

قرآن مجید صحابہ ہی کے زمانے میں سات منزلوں میں بٹا ہوا تھا حجاج نے اسے تیس حصوں میں تقسیم کرایا اور ہر حصے کو ربع، نصف اور ثلث میں تقسیم کیا۔

اسلوب بیان وطرز استدلال

شاہ ولیؒ نے اپنے رسالہ "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" میں نہایت عمدگی اور اختصار کے ساتھ قرآن مجید کے اسلوب سے بحث کی ہے۔ یہاں اس کا خلاصہ لکھا جاتا ہے۔

قرآن مجید کو مثل معمولی کتابوں کے ابواب وفصول میں اس طرح مترتب نہیں کیا گیا کہ ایک موضوع بحث کو ایک جداگانہ باب یا فصل میں بیان کیا جاتا۔ بلکہ قرآن مجید کو مثل مجموعۂ مکتوبات کے فرض کرنا چاہیے جس طرح کہ بادشاہ اپنی رعایا کو حسب ضرورت وقت فرمان لکھتا رہتا ہے حتیٰ کہ بہت سے فرمان جمع ہو جاتے ہیں۔ پھر کوئی شخص ان تمام فرامین کا ایک مجموعہ تیار کر دیتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو بادشاہ حقیقی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حسب ضرورت قرآن مجید کی سورتیں یکے بعد دیگرے نازل فرمائیں یہ سورتیں بعض بہت بڑی، بعض درمیانی اور چند بہت چھوٹی ہیں۔ ان سورتوں کی ابتدا وانتہا میں خطوط کے مروجہ طریقہ کو اپنایا گیا ہے۔ خطوط کے شروع کرنے کی کئی صورتیں ہیں:

اوّل یہ ہے کہ خطوط کی ابتدا حمد وثنا کے ساتھ کی جائے۔

دوم بغیر کسی تمہید کے اظہار مدعا کیا جائے اور بیان غرض شروع کر دیا جائے۔

سوم شروع میں کاتب یا مکتوب الیہ کا نام درج کیا جائے۔

چہارم بغیر کسی عنوان یا القاب ہی کے آغاز کر دیا جائے۔

قرآنی سورتوں کی ابتدا کرنے میں بھی یہی چار صورتیں پیش نظر رہی ہیں پہلی صورت کی مثال جس میں حمد باری تعالیٰ سے ابتدا کی جاتی ہے بہت سی ہیں مثلاً سبحان الذی بیدہ الملکوت یا سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً وغیرہ وغیرہ۔ دوسری قسم جس میں ابتدا ہی بیان مقصود سے کی گئی ہو اس کی مثال سورۂ بقر ہے جس میں ذالک الکتب لاریب فیہ ھدی للمتقین سے سورہ کا آغاز کیا گیا ہے۔ دوسری مثال سورۃ انزلناھا وفرضنٰھا سے تیسری قسم کی مثال تنزیل الکتب من اللہ العزیز الحکیم یا کتب احکمت ایاتہ ثم فصلت من لدن حکیم خبیر ہے۔ چوتھی قسم کی مثالیں اذا جاءک المنفقون یا قد سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجھا، یا یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک ہیں۔

خطوط کے طرز کے علاوہ بعض قرآنی سورتوں کا آغاز عربی قصائد کی طرح عجیب وغریب مقامات اور

ہولناک واقعات کے ذکر سے بھی کیا گیا ہے مثلاً۔ والصّٰفّٰت صفا فالزّٰجرات زجراً یا والذّٰریٰت ذرواً فالحٰملٰت وقراً یا اذا الشّمس کوّرت واذا النّجوم انکدرت وغیرہ۔

آغاز کی طرح اختتام میں بھی اکثر سورتوں میں خطوط ہی کے طرز نگارش کو اپنایا گیا ہے۔ بالعموم خطوط کو کلماتِ جامعہ یا وصایائے نادرہ سے ختم کیا جاتا ہے۔ یا سابقہ احکامات کے لیے تاکید اور خلاف ورزی کرنے والوں کو تہدید کی جاتی ہے۔ اسی طرح قرآنی سورتیں بھی نہایت بلیغ کلموں اور نادر نصائح، تاکید و تہدید پر ختم ہوئی ہیں۔

جس طرح قصائد اشعار میں منقسم ہوتے ہیں اسی طرح اکثر سورتوں میں سنت اللہ یوں جاری ہے کہ وہ آیات پر منقسم ہوتی ہیں۔ اشعار و آیات دونوں میں التذاذ نفس اور حظ طبعی کا لحاظ رکھا جاتا ہے لیکن اشعار میں عروض و قوافی کی پابندی کی جاتی ہے اور آیات کی بنیاد ایک ایسے اجمالی وزن و قوافی پر ہوتی ہے جو امر طبعی سے زیادہ مشابہ ہوتا ہے۔ لیکن ماہرین عروض کے مقرر کردہ اوزان اور ان کے بتلائے ہوئے اصول قوافی کو مدنظر نہیں رکھا جاتا بلکہ یہ اوزان و قوافی بجائے فطری ہونے کے محض مصنوعی اور اصلاحی ہیں۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ ایسے کلام سے خاص لطف حاصل کرتا ہے جس کے اجزاء باہم موافقت رکھتے ہوں۔ کلام میں اس موافقت کو پیدا کرنے کی غرض سے جب اصول و قواعد وضع کئے گئے تو ہر قوم و زبان میں اختلافات رونما ہو گئے۔ اہل عرب ایک خاص قانون رکھتے ہیں۔ ہندیوں کے اصول شعر جداگانہ ہیں۔ غرضیکہ ہر زمانہ کے لوگوں نے ایک خاص وضع اختیار کی ان مختلف اصولوں میں ایک ہی چیز مشترک نظر آتی ہے وہ اجزائے کلام میں تخمینی موافقت و مناسبت ہے۔ اقوام عالم کے قوانین نظم میں زبردست اختلافات کے باوجود تمام قومیں دل کش آوازوں اور دلفریب نغمات سے لذت پاتی ہیں۔ خداوند جل جلالہ نے جب اس مشت خاک (انسان) سے ہم کلام ہونا چاہا تو اس نے اس شئے مشترک یا اجمالی حسن کا لحاظ کیا ان قواعد کو پیش نظر نہیں رکھا جن کو ایک قوم پسند کرتی ہے لیکن دوسری قوم ناپسندیدگی کا اظہار کرتی ہے اور جو زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ کیونکہ اصلاحی قوانین کی پابندی عجز و جہل کی دلیل ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اکثر سورتوں میں آواز کی کشش کا اعتبار کیا ہے نہ کہ بحر طویل و بحر مدید کا۔ اور فاصلوں میں سانس کا ٹھہرنا حرف مدہ پر یا جس پر مد ٹھہرے اس کا اعتبار کیا ہے نہ کہ فن قوافی کے قواعد کا۔ نرخرے میں سانس کی آمد و رفت انسان کے لیے ایک جبلی بات ہے۔ گو سانس کی درازی اور کوتاہی ایک حد تک آدمی کے اختیار میں ہے لیکن

اگر اسے اپنی طبیعت پر چھوڑ دیا تو اس وقت اس کا ایک خاص طول ہوگا۔ سانس کے اسی امتداد کو خداوند تعالیٰ نے وزن قرار دیا اور سانس کا اختتام ایسے حروف پر رکھا گیا جس کا اعتماد کسی حرف پر ہو۔ یہ ایک وسیع قافیہ ہے جس کو طبیعت ادراک کرتی ہے اور اس کی تکرار سے متلذذ ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ حروف مدہ کہیں الف کہیں واؤ اور کہیں ی ہوتا ہے اور گو وہ حروف آخر کسی جگہ ی ہوتا ہے اور کہیں ج یا ق۔ کہیں آیات کا اتحاد ایک حرف پر ہوتا ہے مثلاً میم سورہ قتال میں اور نون سورہ رحمٰن میں حلاوت بخشتا ہے اور ایک مخصوص جملہ کی تکرار بھی لذت کا باعث بنتی ہے جیسے سورۂ شعراء، سورہ قمر، سورہ رحمٰن اور مرسلات میں۔ کبھی سرور پیدا کرنے کے لیے سورتوں کے آخری فواصل اول سے مختلف کئے جاتے ہیں مثلاً ادا اور ہدا سورہ مریم کے آخر میں اور سلاما اور کراما سورہ فرقان کے آخر میں اور وطین، ساجدین اور ینظرون سورہ صاد کے آخر میں واقع ہے۔ حالانکہ ان تمام سورتوں کے شروع میں دوسری طرح کے فاصلے ہیں۔ آیت کے آخر میں اگر کوئی لفظ قافیہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اس کو قافیہ بنا دیا جاتا ہے ورنہ کسی ایسے جملے سے اس کا اتصال کر دیا جاتا ہے جس میں آلاء اللہ کا ذکر یا مخاطب کے لیے تنبیہ ہو۔ مثلاً ھو الحکیم الخبیر، کان اللہ علیما حکیما وغیرہ وغیرہ۔ بعض اوقات پہلے فقروں کو بعد کے فقروں سے کم لاتے ہیں تاکہ کلام اس کے سبب سے شیریں ہو جائے مثلاً خذوہ فغلوہ، ثم الجحیم صلوہ ثم فی سلسلۃ ذرعہا سبعون ذراعا فاسلکوہ پہلے اور دوسرے فقرے کا مجموعہ تیسرے کے برابر ہے۔

قرآن کریم کی بلاغت انسانی طاقت سے بالاتر ہے۔ شیریں کلمات اور چست بندشوں کا استعمال جس لطافت، سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ ہمیں قرآن میں ملتا ہے اتنا متقدمین اور متاخرین کے کسی قصیدہ میں نہیں پایا جاتا۔

مکی آیات جو قرآن مجید کے دو تہائی حصہ پر مشتمل ہیں زبان اور زور بیان کے لحاظ سے اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔ ان کا ایک خاص ترنم ہے جو پڑھنے والے کو مسحور کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔

قرآن مجید کا طرز استدلال بھی نرالا ہے۔ نظریات کے اثبات کے لیے منطقی دلائل سے کام نہیں لیا گیا ہے کیونکہ اس کے مخاطبین اولین اس طرح کے بحث و مباحثہ سے قطعاً ناواقف تھے۔ جہلاء عرب سے جب مباحثہ کیا گیا تو ان کے مسلمات سے جو ملت حنیفیہ کی بقایا تھے استدلال کیا تاکہ الزام ان پر پوری طرح ثابت ہو جائے۔

قرآنی طرز استدلال کو بہت حد تک تاریخی کہنا بجا ہے۔ قرآن کریم اپنی تعلیمات کی وضاحت بالعموم گذشتہ اقوام کی تاریخ کے ذریعہ کرتا ہے۔ مثلاً یہ ثابت کرنے کے لیے کہ فتح و کامیابی کا دارومدار تعداد افواج پر نہیں ہے طالوت اور جالوت کی جنگ کا واقعہ بیان ہوا۔ جس میں بنی اسرائیل کی خواہش جہاد پر ایک بادشاہ طالوت کا تقرر عمل میں آیا۔ لیکن اسرائیلی فوج جب طالوت کی ہم رکابی میں جنگ کرنے کے لیے روانہ ہوئی تو راستے کی تکالیف برداشت نہ کر سکی اور امتحان میں پوری نہ اتری۔ آخر کار مٹھی بھر آدمیوں کے ذریعہ جالوت کی زبردست فوج کا مقابلہ کیا گیا اور نتیجۃً جالوت قتل ہوا۔ ایک اور موقعہ پر قرآن کریم اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں کہ جو قومیں سرکش و نافرمان ہوتی ہیں اور اپنے حکام کے احکامات کی پابندی نہیں کرتیں وہ ہمیشہ ذلیل و خوار رہتی ہیں۔ اس سلسلے میں بنی اسرائیل کی شرارتوں اور نافرمانیوں کا تفصیلی بیان کیا گیا۔ آخر کار انہیں ارض مقدس میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان سے فتح و نصرت کا واضح وعدہ بھی کیا گیا لیکن اس کے باوجود اس نافرمان اور بدطینت قوم نے ٹکا سا جواب دیدیا کہ یا موسیٰ اذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون (اے موسیٰ تم اور تمہارا رب جا کر جنگ کرو ہم تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں)۔ قرآن میں غیر مشہور اور غیر معروف واقعات سے احتراز کیا گیا ہے اور صرف ایسے ہی واقعات بیان کئے گئے ہیں جن سے اہل عرب آشنا تھے مثلاً قوم نوح، عاد اور ثمود کی روداد جس کو اہل عرب اپنے باپ دادا سے مسلسل سنتے چلے آئے تھے۔ حضرت ابراہیم اور انبیاء بنی اسرائیل کی داستانیں جن سے باشندگان عرب یہود کے ساتھ اختلاط کے سبب واقف تھے۔ یہ واقعات از اول تا آخر بیان نہیں ہوئے بلکہ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ مخاطب پہلے سے واقف ہے اس لیے صرف ان ضروری حصوں کو بیان کیا گیا جو عبرت اور موعظت کا موجب بن سکتے تھے۔ تمام قصوں کو ان کی تمام خصوصیات کے ساتھ بیان نہیں کیا اس میں حکمت و مصلحت یہ ہے کہ عوام الناس جب کوئی عجیب و غریب داستان سنتے ہیں یا کوئی داستان اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ان کے سامنے بیان کی جاتی ہے تو ان کی طبیعت محض اس داستان کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور پند و نصیحت کا جو داستان بیان کرنے کا اصل مقصد ہے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ قرآن میں بے شمار ایسے واقعات ہیں جو بار بار مختلف سورتوں میں مختلف طریقوں سے بیان کئے گئے ہیں جن سے مقصود یہ نہیں ہے کہ ان واقعات سے آگاہی حاصل ہو جائے بلکہ مقصود یہ ہے کہ سننے والوں کے ذہن شرک و معاصی کی برائیوں کی جانب منتقل نہ ہوں۔

قرآن مجید تاریخی واقعات کے علاوہ ضرب الامثال اور مشہور حکایات سے بھی استدلال کرتا ہے

مثلاً خداوند تعالیٰ کی نافرمانی اور کفر و عصیان کی خرابی کا ذکر نہایت موثر انداز میں اس طرح کیا گیا ہے:

وضرب اللہ مثلاً قریۃ کانت اٰمنۃ مطمئنۃ یاتیھا رزقھا رغداً من کل مکان فکفرت بانعم اللہ فاذاقھا اللہ لباس الجوع والخوف بما کانوا یصنعون (اللہ تعالیٰ نے ایک گاؤں کی کہاوت بیان کی ہے جہاں ہر طرح امن و اطمینان کا دور دورہ تھا۔ ہر طرف کثرت سے اس کے پاس روزی آتی تھی۔ اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تب اللہ نے اس کو بھوک اور خوف کے لباس کا مزہ چکھایا۔ یہ بدلہ ہے ان برے اعمال کا جو وہ کیا کرتے تھے)۔ ایک اور مثال لیجئے۔ قرآن مجید لوگوں کو شاہراہ ترقی پر گامزن رہنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور ثبات قدمی اور اولوالعزمی کے ساتھ آگے بڑھتے رہنے کی تاکید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنی جدوجہد پر پانی پھیر کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہو تو اس کی مثال یہ دیتا ہے لا تکونوا کالتی نقضت غزلھا من بعد قوۃ انکاثا (اس بڑھیا کی طرح نہ ہو جس نے اپنا محنت سے کاتا ہوا سوت خود تار تار کر دیا)۔

قرآن مجید تشبیہات کو بھی بطور ثبوت استعمال کرتا ہے اور ان کے ذریعہ لوگوں میں نیکی کی طرف رغبت اور برائی سے نفرت پیدا کر دیتا ہے۔ قرآنی تشبیہات نہ تو دور از کار ہوتی ہیں اور نہ ہی غیر محسوس۔ بلکہ نہایت جامع اور محسوس ہوتی ہیں جو طبیعتوں پر عمدہ دلائل سے بھی زیادہ اثر کرتی ہیں۔ جب قرآن حکیم میں کسی نیک کام کی مثال دی جاتی ہے تو انسانی طبائع خود بخود اس کی طرف کھنچنے لگتی ہیں۔ مثلاً انفاق فی سبیل اللہ کی مثال یوں دیتا ہے:

مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضعف لمن یشآء واللہ واسع علیم۔

ان لوگوں کی مثال جو راہ خدا میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اس دانہ کی ہے جس سے سات بالیں اگیں اور ہر بال میں سو دانے ہوئے۔ اور اللہ جس کے لیے چاہے بڑھا دیتا ہے۔ اللہ وسعت دینے والا اور سننے والا ہے۔

قرآن کریم جب کسی فعل قبیح کی مثال دیتا ہے تو انسانی طبائع اس سے نفرت کرنے لگتی ہیں۔ اسی طرح غیبت کی برائی جہاں مذکور ہوئی اس کو اس طرح سے بیان کیا ہے:

لا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضاً ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتاً فکرھتموہ۔

کسی کی عیب جوئی میں نہ لگے رہا کرو اور تم میں سے ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے کیا تم سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تم اس سے کراہت کرتے ہو۔

یا یتیموں کے مال کھانے کی ایسی مثال دی گئی ہے جس کو سن کر شقی سے شقی لرزہ براندام ہو جاتا ہے ۔ فرمایا ہے:

ان الذین یاکلون اموال الیتٰمی ظلما انما یاکلون فی بطونھم نارا وسیصلون سعیرا

جو لوگ ظلم سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور عنقریب آگ میں داخل ہوں گے ۔

قرآنی دلائل میں سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ دعویٰ اور دلائل کا اس قدر عمدہ امتزاج ہوتا ہے کہ پڑھنے والا پڑھ کر اور سننے والا سن کر محسوس بھی نہیں کرتا کہ اس نے کوئی دلیل پڑھی یا سنی ہے بلکہ خود بخود اس کے خلاف نظریات کا باطل ہونا اس کے ذہن نشین ہو جاتا ہے ۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے عقیدے پر قرآن اس طرح تبصرہ کرتا ہے:

ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل وامہ صدیقۃ کانا یاکلان الطعام

مریم کا بیٹا مسیح محض ایک رسول کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں ۔ اس کی ماں صدیقہ ہے اور وہ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے ۔

اس مختصر سی آیت کے چھوٹے سے ٹکڑے میں الوہیت مسیح کا عقیدہ اس طرح باطل کیا گیا ہے کہ حضرت مسیحؑ حضرت مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوئے اور خدا کسی کے بطن سے پیدا نہیں ہوتا اور پھر امہ صدیقۃ فرما کر یہ ظاہر کر دیا کہ حضرت مریمؑ نے نہ خود کے اقنوم ہونے اور نہ اپنے بیٹے کے اقانیم ثلاثہ میں ہونے کا کبھی دعویٰ کیا وہ صدیقہ تھیں ایسی جھوٹ بات کیسے کہہ سکتی تھیں ۔ اور پھر اللہ تعالیٰ تو عام انسانوں کی طرح کھانے پینے کا محتاج نہیں ہوتا برخلاف اس کے یہ دونوں ماں بیٹے کھانا کھایا کرتے تھے تو یہ اللہ کیسے ہو سکتے ہیں ۔ اس آیت کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ ہی الوہیت مسیح کا عقیدہ بغیر احساس دلائل کالعدم ہو جاتا ہے ۔

سیاسی نظریات

قرآنی نظریاتِ سیاست نہایت واضح اور قابل عمل ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ قیام امن و امان اور عدل و انصاف کا واحد ذریعہ بھی ہیں ۔ آج دنیا دو مرتبہ جنگ کی بھٹی میں گزرنے کے بعد بھی جنگی خطرات سے دوچار ہے اور افق پر جنگ کے کالے کالے بادل تیسری مرتبہ پھر نمودار ہونے شروع ہو گئے ہیں جس کی وجہ کوئی ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے ۔ انسانیت مختلف ازم میں بٹ کر رہ گئی ہے اور ہر گروہ

دوسرے سے گوئے سبقت لے جانے کا خواہاں ہے۔ اس سیاسی تفوق کی خواہش نے انسان کو بالکل درندہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ قانون سازی کے اختیارات انسان نے سنبھال کر اپنے ہم جنسوں کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ قرآن حکیم ان سیاسی مسائل کا کیا حل تجویز کرتا ہے جنہوں نے انسانیت کو ہلاکت کے گڑھے کے کنارے لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ نزول قرآن کے وقت بھی انسانیت ان سے ملتے جلتے مسائل سے دوچار تھی کنتم علیٰ شفا حفرۃ من النار فانقذکم منھا (تم آگ کے گڑھے کے بالکل کنارے پہنچ چکے تھے تم کو اللہ تعالیٰ نے ان سے نکالا)۔

اقتدار اعلیٰ

قرآن مجید کے سیاسی نظریات میں اہم ترین اقتدار اعلیٰ کا نظریہ ہے۔ اس کی رو سے اقتدار اعلیٰ کسی انسان کے سپرد نہیں کیا گیا ہے کیونکہ یہ ظلوم وجہول اتنی بڑی ذمہ داری کا متحمل نہیں ہو سکتا ہے۔ مقتدر اعلیٰ اسی ذات حقیقی کو قرار دیا گیا ہے جو نہ صرف خالق کائنات ہے بلکہ کائنات کی ربوبیت بھی اسی کے لیے مسلّم ہے۔ یہی ذات عقائد واعمال، تدبر وسیاست، دستور وقانون کا سرچشمہ ہے۔ اقتدار اعلیٰ کے لیے قرآن مجید نے نہایت جامع لفظ "ملکوت" استعمال کیا ہے جس کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر ہر چیز اللہ ہی کے زیر اقتدار ہے من بیدہ ملکوت کل شئ (وہ کونسی ہستی ہے جس کے زیر اقتدار تمام چیزیں ہیں؟) دوسرے موقعہ پر مقتدر اعلیٰ کی پاکی اور بے عیبی ان الفاظ میں مذکور ہے فسبحن الذی بیدہ ملکوت کل شئ (وہ ذات پاک ہے جس کے زیر اقتدار تمام چیزیں ہیں)۔ یہی نہیں روئے زمین ہی کی چیزیں اس کے زیر تصرف ہوں بلکہ آسمانوں پر بھی اسی کا حکم جاری وساری ہے کذالک نری ابراھیم ملکوت السمٰوٰت والارض (ہم نے اسی طرح ابراہیمؑ کو آسمان اور زمین کے اقتدار اعلیٰ کے عجائبات کا نظارہ دکھایا)۔

قرآن مجید میں اس مقتدر اعلیٰ کو مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ ان ناموں کو اسمار الحسنیٰ فرمایا ہے۔ رب العالمین اور رب العرش العظیم اس کے نام ہیں۔ کہیں الملک القدوس، الملک الحق اور ملک الناس کے ناموں سے اسے یاد کیا گیا ہے۔ احکم الحاکمین اور خیر الحاکمین کے الفاظ بھی اسی مقتدر اعلیٰ کا اظہار کرتے ہیں۔

قرآن مجید نے مملکت کے لیے الملک کا لفظ کا استعمال کیا ہے۔ رقبہ کے اعتبار سے یہ مملکت نہ صرف ارضی ہے بلکہ مشرق سے مغرب تک، اور شمال سے لے کر جنوب تک، داخل ہونے کے علاوہ

اس میں آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے سب داخل ہے۔ فرمایا ہے وللہ المشرق والمغرب (مشرق و مغرب اللہ ہی کا ہے) للہ ملک السمٰوٰت والارض (زمین اور آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے) اور تبٰرک الذی لہ ملک السمٰوٰت والارض وما بینھما (برکت والا ہے وہ جس کے لیے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کی بادشاہت ہے) اور یہ بادشاہت وقتی اور عارضی نہیں ہے فللہ الاٰخرۃ والاولیٰ (دنیا اور آخرت اللہ ہی کے لیے ہے)۔

الحکم کے لفظ سے قرآن مجید اسلامی حکومت مراد لیتا ہے۔ حکومت کا حقدار بھی خداوند تعالیٰ ہی ہے ان الحکم الا للہ (حکومت کسی کا حق نہیں ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے) دوسری جگہ فرمایا ہے لم یکن لہ شریک فی الملک (حق کی حکومت میں کوئی شریک نہیں ہے)۔

اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات

قرآن مجید مقتدر اعلیٰ کی چند خصوصیات بھی بیان کرتا ہے جو اسے دیگر حکمرانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ان میں وحدتِ اقتدار، حیاتِ ابدی، قدرت کاملہ اور سطوت و جبروت بہت اہم ہیں جن پر قرآن مجید نے بہت زیادہ زور دیا ہے۔

وحدتِ اقتدار۔ قرآنی اقتدار اعلیٰ کی اہم ترین خصوصیت اس کا واحد ہونا ہے۔ مقتدر اعلیٰ ہر ہر حیثیت سے منفرد و یکتا ہے نہ صرف ذاتی بلکہ صفاتی لحاظ سے بھی اس کا کوئی ثانی نہیں لیس کمثلہ شیئ (اس کے مانند کوئی بھی چیز نہیں) حکومت و اقتدار صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے ان الحکم الا للہ (حکومت صرف خداوند تعالیٰ کے لیے ہے) اور پھر اس کی حکومت میں کوئی بھی شریک و ساجھی نہیں لم یکن لہ شریک فی الملک (کوئی بھی حکومت میں اس کا شریک نہیں)۔

قرآن حکیم میں وحدت اقتدار یا توحید کو بار بار بیان کیا ہے اور اس کی نئی نئی دلیلیں دی ہیں۔ ایک دلیل یہ دی ہے کہ:

وما کان معہ من الہ اذا لذھب کل الہ بما خلق ولعلا بعضھم علیٰ بعض۔	اس کے ساتھ کوئی اور معبود نہیں اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق کو الگ لے بیٹھتا اور ضرور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا۔

دوسری دلیل یہ دی گئی ہے: لو کان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا (اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان دونوں تباہ و برباد ہو گئے ہوتے)۔ ان دلائل کے پیش کرنے کے بعد

انسانوں کو تاکید کی جاتی ہے۔ لاتتخذوا الٰھین اثنین (دو معبود مت بناؤ)۔
اللہ تعالیٰ کی ذات تمام دنیاوی رشتوں سے پاک ہے۔ ما اتخذ صاحبۃ ولا ولدًا (اللہ تعالیٰ نے نہ بیوی اختیار کی اور نہ اولاد)۔

حیاتِ ابدی۔ اقتدارِ اعلیٰ کی ایک اور خصوصیت اس کا غیر فانی ہونا ہے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ اسی صفت کے اظہار کے لیے قرآن مجید الحی والقیوم کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ غیر اسلامی اقتدار میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ آئے دن بدلتا رہتا ہے۔ اور اس میں ابدیت تو درکنار دنیا ہی کا ساتھ دینے کی سکت نہیں ہے۔ نظامِ عالم میں ہم آہنگی اور یکسانیت پیدا کرنے کے لیے ایسے اقتدار کی ضرورت ہے جو از ابتدا تا انتہا قائم رہے۔ قرآن مجید ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ اس کے پیش کردہ نظریہ کے مطابق اقتدارِ اعلیٰ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اسی سے ہی نظامِ عالم کی بقا اور فنا وابستہ ہے۔ للہ الامر من قبل ومن بعد یہی وجہ ہے کہ اس نظام میں ایک تسلسل اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اور اس کے قوانین بالکل اٹل ہیں جن میں کسی قسم کے ردوبدل کی گنجائش نہیں۔

قدرتِ کاملہ۔ ایک اور خصوصیت جس کی نشاندہی قرآن مجید نے کی ہے وہ اقتدارِ اعلیٰ کی قدرتِ کاملہ ہے۔ اس کی مملکت کی کوئی حد نہیں ہے۔ زمین آسمان، چاند، تارے، جمادات، نباتات اور حیوانات سب پر اسی کا سکہ چلتا ہے۔ اس کے اختیارات میں کوئی دخل دینے والا نہیں ہے۔ اس نظریہ کو قرآن میں جا بجا ان اللہ علیٰ کل شئ قدیر (بے شک اللہ تعالیٰ تمام چیزوں پر قدرت رکھنے والا ہے) کہہ کر پیش کیا ہے۔ مخلوقات پر اس کی حکمرانی کا یہ عالم ہے کہ ما من دابۃ الا ھو اٰخذ بناصیتھا (کوئی زمین پر چلنے والا نہیں ہے جس کی چوٹی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں نہ ہو) فرشتوں کو اس کی تسبیح و تہلیل میں دن رات مشغول رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور وہ بغیر اجازت یا حکم کے اتر نہیں سکتے۔ ما نتنزل الا بامر ربک (اے نبی! فرشتے تیرے پروردگار کے حکم کے بغیر نہیں اترتے)۔ تنزل الملٰئکۃ والروح فیھا باذن ربھم (شب قدر میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کی اجازت سے اترتے ہیں)۔

قرآن کریم کے اقتدارِ اعلیٰ کو الوہیت کے ساتھ ساتھ ربوبیت کے اختیارات بھی حاصل ہیں۔ وہ خلاقِ عالم بھی ہے اور اس کا حکمراں اور روزی رساں بھی وہی ہے۔ یہ زمین اور آسمان نہ صرف اس

کے زیر تصرف ہیں بلکہ ان کا پیدا کرنے والا اور ان کو نیست سے ہست میں لانے والا وہی ہے۔ فرمایا ہے۔ الا لہ الخلق والامر (خبردار ہو جاؤ کہ پیدا کرنا اور حکومت کرنا اسی کے لیے مخصوص ہے)۔ اس کے اختیارات اسی دنیا تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس دنیا کی تباہی کے بعد بھی مالک یوم الدین ہوگا اور قیامت کے دن تمام بادشاہوں سے دریافت کرے گا لمن الملک الیوم (آج بادشاہت کس کی ہے؟) کس میں یارائے جواب ہوگا کہ اس کا جواب دے تو خود ہی جواب دے گا۔ للہ الواحد القہار۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے متعلق مزید بیان کیا گیا ہے کہ حکمرانی میں اپنی مرضی کے مطابق کام کرتا ہے کسی کو اس کے حکم میں چون وچرا کرنے کی مجال نہیں ہے۔ فرمایا ہے یحکم ما یرید (جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے) اور واللہ یحکم ولا معقب لحکمہ (اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کوئی اس کے حکم کو پیچھے ڈالنے والا نہیں ہے)۔

سطوت وجبروت بھی قرآنی اقتدار اعلیٰ کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ کی بالادستی مسلّم ہے۔ وہ سب سے بزرگ و برتر ہے کوئی دوسرا اس کے مدمقابل نہیں اللہ ھو العلی الکبیر (وہی سب سے بلند و بزرگ ہے)۔ اس کی ذات میں جملہ قوتیں جمع ہیں ان القوۃ للہ جمیعاً (بے شک سب قوت اللہ ہی کے لیے ہے)۔ ایک اور جگہ فرمایا۔ ان ربک ھو القوی العزیز (بے شک تیرا رب ہی قوت والا اور غالب ہے) وہ اپنے بندوں پر مکمل غلبہ رکھتا ہے۔ ھو القاھر فوق عبادہ۔ حتیٰ کہ جس فرد یا قوم کو عزت دے تو کوئی ذلیل نہیں کر سکتا اور جسے ذلیل کرے تو اسے عزت دینے والا کوئی نہیں۔ وان یمسسک اللہ بضر فلا کاشف لہ الا ھو وان یردک بخیر فلا راد لفضلہ (اگر خدا تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس تکلیف کا سوائے اس کے اور کوئی دور کرنے والا نہیں۔ اور اگر تجھے بھلائی پہنچانے کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو کوئی ہٹانے والا نہیں)۔ قوموں کا عروج و زوال بھی اس کے رحم و غضب پر منحصر ہے۔ اذا اراد اللہ بقوم سوءً فلا مردّ لہ وما لھم من دونہ من وال (جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو کوئی اس کا دفع کرنے والا نہیں ہے اور اس کے سوا کوئی ان کا کارساز نہیں ہے)۔

کائنات

ساری کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ کائنات کی تخلیق میں اسے کسی قسم کی دقت یا تکلیف

محسوس نہیں ہوئی وہ خود فرماتا ہے کہ ما مسنا من لغوب (ہمیں کسی قسم کی تکان نہیں ہوئی) صرف لفظ کُن کے کہہ دینے سے چیزیں پیدا ہو گئیں۔ واذا قضیٰ امراً فانما یقول لہ کن فیکون (جب وہ کسی کام کا ارادہ کر لیتا ہے تو صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے)۔ اس تخلیق میں اس کی اپنی مرضی کے سوا کسی کو دخل حاصل نہیں۔ یخلق ما یشاء اس کی شان ہے۔ صرف اس نے کائنات کو پیدا ہی نہیں کیا بلکہ جیسے کہ نیست سے ہست میں لانے والا وہی ہے اسی طرح ہست سے نیست کرنے والا وہی ہوگا۔ اللہ یبدؤ الخلق ثم یعیدہ ثم الیہ ترجعون (اللہ تعالیٰ ہی مخلوق کو اوّل بار پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ پیدا کرتا ہے پھر تم سب اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے) زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی تمام چیزیں اسی ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔ چھ دن میں زمین و آسمان بن کر تیار ہو گئے۔ خلق السمٰوٰت والارض فی ستۃ ایام صرف زمین کی تخلیق پر دو دن لگے خلق الارض فی یومین زمین پر پہاڑ بنانے اور نباتات کے اگانے میں صرف چار دن صرف ہوئے۔

انسان

یہ تمام کائنات انسان کے فائدے اور آرام کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ خلق لکم ما فی الارض جمیعاً (اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین کی تمام چیزیں پیدا کی ہیں) زمین کو حضرت انسان کے لیے قیام گاہ قرار دیا ہے تاکہ وہ ایک مقررہ وقت تک اس کی چیزوں سے تمتع حاصل کر سکے ولکم فی الارض مستقرٌ ومتاعٌ الیٰ حین۔ زمین ہی سے وہ پیدا ہوا ہے وہیں مرے گا اور اسی زمین سے دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ فیھا تحیون وفیھا تموتون ومنھا تخرجون (زمین ہی میں زندگی بسر کرو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی میں سے دوبارہ نکالے جاؤ گے)۔ انسان کی ساخت مٹی کی ہے۔ وہ اگرچہ نحیف و نزار پیدا کیا گیا ہے۔ خلق الانسان ضعیفا لیکن جسمانی لحاظ سے حسن و جمال کا وہ پتلا ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے کہ وصورکم فاحسن صورکم (اللہ تعالیٰ نے تمہاری صورتیں بنائیں اور اچھی صورتیں بنائی ہیں)۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر ساخت کا پیدا کیا ہے)۔ اس کے علاوہ اسے دیگر مخلوقات پر فوقیت عطا فرمائی ہے ولقد کرمنا بنی آدم وحملنٰھم فی البر والبحر ورزقنٰھم من الطیبٰت وفضلنٰھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلا (ہم نے بنی آدم کو فضیلت دی اور ان کو خشکی اور دریا میں ہم اٹھائے پھرے اور ان کو عمدہ عمدہ چیزوں سے رزق دیا اور ان کو بہت سی مخلوقات پر

فضیلت دی)۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے نیک و بد میں تمیز کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ اسی لیے دیگر مخلوقات کے مقابلے میں اس کے اختیارات وسیع ہیں۔ یہ اس کے اختیارات میں داخل ہے کہ انسان چاہے تو اللہ کا فرماں بردار بندہ بنے یا وہ چاہے تو نافرمان بن جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ انا ھدینٰہ السبیل اما شاکرًا و اما کفورًا (بے شک ہم نے انسان کو نیکی اور بدی کے راستے دکھلا دیئے ہیں اب وہ یا تو شکر گزار بن سکتا ہے یا ناشکرا)۔ ایک جگہ اور ہے کہ وھدینٰہ النجدین (ہم نے نیکی و بدی کی دونوں راہیں اسے دکھلا دی ہیں)۔ خیر و شر میں تمیز اس کو الہام کے ذریعہ سکھلائی گئی ہے فالھمھا فجورھا و تقوٰھا (انسان کے دل میں گناہ اور پرہیز گاری ڈال دی گئی ہے)۔ انسان کی یہی عظمت تھی جس کے پیش نظر اسے خلیفۃ اللہ فی الارض بنایا گیا۔ اس کے اس تقرر پر ملائکہ نے ان الفاظ میں احتجاج کیا۔ اتجعل فیھا من یفسد فیھا و یسفک الدماء (کیا آپ روئے زمین میں ایسی مخلوق کو خلافت عطا فرمائیں گے جو فتنہ و فساد برپا کرے گی اور خونریزی کرے گی)۔ لیکن جب انسان اور فرشتوں کی علمیت اور صلاحیت کا مقابلہ ہوا تو فرشتوں کو شکست ہوئی۔

دنیا نے انسانوں کے بہت سے درجے قائم کر دیئے ہیں۔ ادنیٰ اور اعلیٰ کی تفریق پیدا کر دی ہے۔ لیکن قرآن مجید نے انسانوں کی دو ہی گروہ بندی کی ہے۔ ایک مومن اور دوسرا کافر۔ حسب و نسب، مال و دولت کے ذریعہ باہمی امتیاز کو اہل قرار دیا گیا ہے۔ شریف ترین انسان قرآن مجید کی رو سے وہ ہے جو خداوند تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرتا ہو۔ جو لوگ قرآن کی بتلائی ہوئی چند باتوں کا اقرار کر لیتے ہیں وہ مومنین کے زمرہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ وہ کیا باتیں ہیں جن کو مان لینے کا مطالبہ کیا ہے وہ قرآن ہی کے الفاظ میں سنیئے:

اٰمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون ۰ کل اٰمن باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ لا نفرق بین احد من رسلہ و قالوا سمعنا واطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر ہ	جو کتاب رسول اللہ پر نازل ہوئی اس پر تو رسول اللہ خود اور دیگر تمام مومنین ایمان لائے ہیں۔ ان مسلمانوں میں سے ہر ایک اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں پر ایمان لایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم ان پیغمبروں کی حقانیت میں کوئی فرق نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ خداوند ہم نے تیرے احکامات سنے ہم ان کی اطاعت کرتے ہیں تو ہمیں بخش دے ہم سب کو تیرے ہی

پامال نہیں کیا جاتا ہے۔

لیکن صرف زبان سے ایمان لانا کافی نہیں ہے بلکہ ایمان کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب کہ اس کے ذریعہ انسان میں ثبات قدمی اور اولوالعزمی کی صفات حمیدہ پیدا ہو جائیں۔ اس امر کی طرف قرآن مجید نے اس طرح اشارہ کیا ہے :

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لا یفتنون ۝

کیا لوگ اس خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ وہ صرف اس بات کے کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لائے چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی۔

قرآن کریم نے مومنین کی بلند کرداری اور اعلیٰ خلقی پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ اس کے حصول کے لیے چند قانونی پابندیاں بھی عائد کی ہیں اور زیادہ تر اخلاقی بندشوں میں انہیں جکڑ دیا گیا ہے۔ توحید کے ذریعہ ان میں ریاکاری اور نمائش کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا گیا ہے۔ ان مومنین کی پہچان یہ بتلائی کہ جب اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ جب قرآنی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ کا باعث بنتی ہیں۔ مومنین اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔ نماز پابندی سے پڑھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں (سورہ انفال) جہاد و ہجرت کو مومنین کی علامت بتایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ جو لوگ کہ مہاجرین کو پناہ دینے والے اور مہاجرین کی مدد کرنے والے ہیں انہیں بھی مومنین کے زمرے میں داخل کیا گیا ہے۔ فرمایا ہے کہ :

والذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین آووا ونصروا اولٰئک المومنون حقا

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور راہ خدا میں جہاد کیا اور جنہوں نے مسلمانوں کو پناہ دی اور ان کی مدد کی وہی سچے مومن ہیں۔

خلافت

مومنین ہی خلافت ارضی کے مستحق ہیں۔ اللہ کی ہمیشہ سے یہ سنت رہی ہے کہ اپنے نیک بندوں ہی کو اپنی نیابت کے فرائض سپرد کرتا ہے۔ فرمایا ہے :

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم۔

اللہ تعالیٰ نے مومنین اور نیکوکاروں سے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا جس طرح کہ تم سے پہلے لوگوں کو خلافت تفویض کی۔

جیسا کہ پہلے بتلایا جا چکا ہے کہ اقتدار اعلیٰ اللہ کے پاس ہے لیکن انسان کو اس نے خلافت سے سرفراز فرمایا ہے ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ (زمین اللہ ہی کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے وارث بنا دیتا ہے) اس وارث کے متعلق بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔ ان الارض یرثھا عبادی الصالحون (زمین کی خلافت کے وارث صرف میرے نیک بندے ہی ہیں)۔

فرائض

عوام کے دنیاوی مفادات اور دینی مصالح کا خیال رکھنا اس خلافت کے فرائض میں داخل ہے فتنہ و فساد کا انسداد، عدل و انصاف کا قیام، معاشرے کی اصلاح، قانون الٰہی کی حفاظت اور اس کا اجراء، باغیوں کی سرکوبی خلافت کے فرائض ہیں۔ اب ہم ان میں سے ایک ایک فریضہ سے الگ الگ بحث کرتے ہیں۔

۱۔ قیام امن۔ خلافت ارضی کے فرائض میں اہم ترین فریضہ امن و امان کا قیام ہے جس کے بغیر صحیح معنوں میں حکومت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن مجید میں مختلف طریقوں سے امن کی اہمیت بیان ہوئی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑے مہتم بالشان پیغمبر تھے۔ بنائے کعبہ اور آبادی مکہ کے فرائض کی انجام دہی کے بعد اس شہر کے لیے جو دعا کرتے ہیں وہ یہ ہے۔ رب اجعل ھذا البلد اٰمنا وارزق اھلہ من الثمرات (خداوندا اس شہر کو امن کی جگہ بنا دے اور اس کے باشندوں کو میوہ جات کے ذریعہ روزی دے)۔ اس کے علاوہ بنی اسرائیل سے جن باتوں کا عہد لیا گیا ان میں ایک یہ بھی تھا ــــ لا تسفکون دماءکم (کہ تم خونریزی نہیں کرو گے)۔ اکثر و بیشتر انبیاء کرام جو وقتاً فوقتاً بنی نوع انسان کی ہدایت پر مامور ہوئے ان کی بنیادی تعلیم یہی تھی۔ مثلاً صالح علیہ السلام قوم ثمود کو اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کے گنوانے کے بعد ان سے اس چیز کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لا تعثوا فی الارض مفسدین (دیکھو کم از کم یہ کرو کہ روئے زمین میں فساد نہ برپا کرتے پھرو)۔ مدین کو بھی حضرت شعیب علیہ السلام نے جہاں بہت سی چیزوں سے منع فرمایا وہاں فتنہ و فساد پھیلانے کی شدید ممانعت کی۔ حضرت شعیبؑ کی تعلیمات کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم کی تین سورتوں ــــ سورۂ ہود، سورۂ شعراء اور سورہ عنکبوت ــــ میں۔ لا تعثوا فی الارض مفسدین کے الفاظ دہرائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں فتنہ کو قتل سے زیادہ سخت جرم قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا ہے:

الفتنۃ اشد من القتل اور جہاد کا وجوب اس وقت تک مسلمانوں پر ہے جب تک کہ فتنہ بیخ و بن سے
ختم نہ ہو جائے۔ قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ (ان کافروں سے جنگ جاری
رکھو حتیٰ کہ فتنہ و فساد برائے نام بھی باقی نہ رہ جائے اور دین خالصۃً اللہ ہی کے لیے ہو جائے) مفسدین کے
لیے قرآن مجید میں بے شمار مواقع پر وعید آئی ہے کئی جگہ فساد برپا کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ مفسدین
کے حرکات کی پردہ دری کر کے مسلمانوں کو ایسا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ فرمایا ہے۔ سعی فی الارض
لیفسد فیھا ویھلک الحرث والنسل (وہ کوشش کرتا ہے کہ روئے زمین پر فساد برپا کرے۔ کھیتی
باڑی اور نسل کو تباہ و برباد کر دے) یہ بھی فرمایا ہے کہ مفسدین کے منصوبے خاک میں مل کر رہتے ہیں اور کبھی
انہیں کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا ان اللہ لا یصلح عمل المفسدین (اللہ تعالیٰ مفسد لوگوں کے
کام بننے نہیں دیتا) بلکہ ایک سے زیادہ موقعوں پر فتنہ پردازوں کو اللہ کی محبت سے محروم قرار دیا
گیا ہے۔ ان اللہ لا یحب المفسدین (اللہ تعالیٰ مفسدوں کو دوست نہیں رکھتا)

قرآن کریم میں چند ہی جرائم کی سزائیں بیان کی گئی ہیں ان میں باغیوں اور مفسدوں کے لیے شدید
ترین سزا تجویز ہوئی ہے۔ فرمایا ہے

انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون	ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں
فی الارض فسادًا ان یقتلوا او یصلبوا	اور روئے زمین پر فتنہ و فساد برپا کرتے پھرتے ہیں یہ ہے کہ
او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف	وہ قتل کر دیئے جائیں یا ان کو پھانسی پر لٹکایا جائے یا مخالف
او ینفوا من الارض۔	طرف کے ہاتھ اور پیر کاٹ لیے جائیں یا ان کو جلا وطن کر دیا جائے

۲۔ قیام عدل۔ اسلامی خلافت کا دوسرا فریضہ عدل و انصاف کا قائم کرنا ہے۔ خلیفہ کو فصل خصومات
نیز دیگر امور مملکت کی انجام دہی میں غیر جانبدار رہنا چاہیئے۔ قرآن مجید میں انصاف کرنے کا صریحی حکم دیا
گیا ہے۔ فرمایا ہے۔ ان اللہ یامر بالعدل (اللہ تعالیٰ تمہیں انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے) دوسری جگہ
حکم دیا ہے واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل (جب تم لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرو تو انصاف
کے ساتھ کیا کرو) یہی نہیں بلکہ خلیفہ کو تاکید کی گئی ہے کہ انصاف میں اپنی خواہشات کو دخل نہ دیں۔ ذاتی عناد
اور دشمنی کے باعث انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ لا یجرمنکم شنآن قوم علی الا تعدلوا
اعدلوا ھو اقرب للتقوی (کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو
انصاف ہر حال میں کرو انصاف تقویٰ سے بہت قریب ہے) حتیٰ کہ یہود مدینہ نے رسول اللہ صلعم کی

ایذا رسانی میں کونسا دقیقہ اٹھا رکھا تھا۔ یہاں تک کہ متعدد بار قتل کرنے کے منصوبے بھی بنائے ان تمام چیزوں کے باوجود آپ کو حکم دیا گیا۔ ان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ان اللہ یحب المقسطین (اگر آپ یہود کے معاملات کا فیصلہ کریں تو انصاف کے ساتھ کریں (اس بات کو ذہن میں رکھیں) کہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو درست رکھتا ہے)

قرآنی تعلیمات کی یہ خصوصیت ہے کہ جب کسی مہتم بالشان کام کا حکم دیا جاتا ہے تو اس حکم کی عدم تعمیل میں جو قباحتیں مضمر ہوتی ہیں ان کو بھی بیان کر دیا جاتا ہے تاکہ اس حکم کی پیروی کرنے کے فوائد اور اس کی خلاف ورزی کرنے کے نقصانات دونوں نظروں کے سامنے رہیں۔ یہی حال عدل کا ہے۔ قرآن مجید نے عدل کی تاکید کی اور اس کے فوائد گنوائے تو ظلم کے مضر اثرات کی بھی نشاندہی کی تاکہ انسانی طبائع عدل کی طرف راغب اور ظلم سے متنفر ہو جائیں۔ ظلم کے متعلق کئی جگہ قرآن مجید میں اس بات سے مطلع کیا گیا ہے کہ ظالم گمراہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت و رہنمائی سے وہ محروم ہوتا ہے۔ کبھی۔ واللہ لا یھدی القوم الظالمین فرمایا اور کہیں ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین ارشاد ہوا ہے۔ ظاہر ہے جو قوم یا فرد ہدایت الٰہی سے محروم ہوں گے ان کا زیادہ دن تک برسر اقتدار رہنا امر محال ہے۔ یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت سے محروم رکھتا ہے بلکہ وہ ظالموں کو اور بھی کفر و معصیت میں مبتلا ہو جانے کے مواقع فراہم کر دیتا ہے۔ ویضل اللہ الظالمین (اللہ تعالیٰ ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے) جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ظالم حکام کھلی گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں بل الظالمون فی ضلال مبین اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ بالکل بے یار و مددگار اور بغیر کسی مونس و غم خوار کے رہ جاتے ہیں۔ والظالمون ما لھم من ولی ولا نصیر (ظالم لوگوں کا نہ کوئی دوست ہوتا ہے اور نہ ہی مددگار) اور وہ اللہ تعالیٰ کی لعنت کے مستحق قرار پاتے ہیں لعنۃ اللہ علی الظالمین۔ حالت نزع میں ان کی جو حالت ہوتی ہے اس کو قرآن کے الفاظ ہی میں سنیئے:

ولو تری اذ الظلمون فی غمرات الموت والملئکۃ باسطوا ایدیھم اخرجوا انفسکم الیوم تجزون عذاب الھون۔

کاش تو ظالموں کو اس وقت دیکھے کہ موت کی بے ہوشی ان پر طاری ہو اور فرشتے ان کی طرف اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ اپنی جانیں نکالو۔ آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی۔

اس عذاب کو جو ظالموں کو دیا جائے گا قرآن نے مختلف مواقع پر مختلف الفاظ استعمال کئے ہیں کہیں عذاب الھون کہا گیا ہے۔ کہیں عذاباً نکراً (برا یا سخت عذاب) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک موقع

یرعذاب الخلد (دوامی عذاب) بھی آیا ہے۔ عذاب الیم، عذاب کبیر اور عذاب عقیم بھی فرمایا گیا ہے۔ ظالموں کے بارے میں غالباً سب سے زیادہ دل ہلا دینے والی آیت یہ ہے:

انا اعتدنا للظلمین نارا احاط بھم سرادقھا وان یستغیثوا یغاثوا بماءٍ کالمھل یشوی الوجوہ بئس الشراب وساءت مرتفقا۔

منکروں کے لیے ہم نے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں ان کو چاروں طرف سے گھیر لیں گی اور اگر فریاد کریں گے تو جس پانی سے ان کی فریاد رسی کی جائے گی وہ پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا منہ کو بھون ڈالے گا۔ برا پانی ہے اور آرام کے اعتبار سے بُری جگہ ہے۔

ان آیات کے علاوہ قرآن کریم میں اور بھی آیتیں ہیں جن میں ظالموں کے عبرت ناک انجام، ان کی حسرت و ندامت، بے بسی اور بے کسی کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی گئی ہے۔

عدل و انصاف کا قیام صرف حکمراں ہی پر فرض نہیں ہے بلکہ عوام سے بھی حکومت الٰہیہ میں یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ اس سلسلے میں حکومت کے ساتھ تعاون کریں گے۔ مجرمین کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے شہادت چھپانے کی ہرگز کوشش نہ کریں گے خواہ اس شہادت کی وجہ سے ان کے والدین اور دیگر قریبی اعزاء ہی کیوں نہ متاثر ہوتے ہوں۔ یہی نہیں بلکہ خود اپنی جان کی پرواہ نہ کرکے انہیں صحیح شہادت دینا چاہیئے فرمایا ہے کہ کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین۔ (اے مسلمانو! تم خدا کے لیے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جایا کرو خواہ یہ گواہی تمہارے یا تمہارے والدین اور تمہارے اعزا ہی کے خلاف کیوں نہ ہو) کسی مملکت میں ایسے افراد موجود ہوں تو ظاہر ہے کہ عدل و انصاف کا کام کتنا آسان ہو جائے گا۔ گواہی چھپانے والے کو گناہگار بتلایا گیا ہے ومن یکتمھا فانہ اثم قلبہ (اور جو شخص شہادت کو چھپائے گا تو یقیناً اس کا دل گناہ گار ہوگا) گواہی کے متعلق اس امر کی بھی تصریح کر دی گئی ہے کہ دبی زبان سے باتیں نہ بتلائی جائیں بلکہ نہایت وضاحت کے ساتھ دلیرانہ طور پر بیان دیا جائے اور نہ ہی گول مول بات کرکے معاملات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرنی چاہیئے ان تلوا او تعرضوا فان اللہ کان بما تعملون خبیرا (تم اگر دبی زبان سے گواہی دو گے یا روگردانی کرو گے تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی خبر رکھتا ہے) ایک موقعہ پر گواہی چھپانے والے کو بدترین ظالم کہا گیا ہے کیونکہ گواہ کی بددیانتی یا بزدلی ظلم کا سب سے بڑا سبب ہوتا ہے ومن اظلم ممن کتم شھادۃ عندہ من اللہ ... (اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جس نے اس گواہی کو

چھپایا ہو جو اللہ کی طرف سے اس پر واجب تھی)۔ ان یکن غنیا او فقیرا فاللہ اولیٰ بھما۔
قرآن مجید گواہوں کو تسلی دیتا ہے کہ انہیں صحیح گواہی دینے کے باعث کسی کے مالی نقصانات کی فکر و امنگیر نہ ہونی چاہیئے کیونکہ امیر و غریب کو اگر نقصان پہنچے بھی تو ان کا خیر خواہ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس لیے یہ سمجھ کر کہ کسی غریب کو سچی شہادت کی وجہ سے نقصان پہنچ جائے گا غلط ہے۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو یہ اختیار رہتا ہے کہ عدالتی معاملات میں اپنے شخصی قوانین کے ذریعہ فیصلہ کرانے کے لیے اپنے ہم مذہبوں کو جج مقرر کریں لیکن کوئی غیر مسلم اگر اسلامی حکومت ہی سے فیصلہ کرانے پر مصر ہو تو حکومت ان کے مقدمات کا فیصلہ کر دے گی۔ لیکن انصاف ہر حالت میں اس کے پیش نظر رہے گا۔ سورہ مائدہ کی ۴۲ سے ۵۰ تک آیتیں اس بات کی طرف دلالت کرتی ہیں۔

(باقی)

تاریخِ جمہوریت

مصنفہ شاہد حسین رزاقی

قبائلی معاشروں اور یونانِ قدیم سے لے کر عہد انقلاب اور دورِ حاضرہ تک جمہوریت کی مکمل تاریخ جس میں جمہوریت کی نوعیت وار تقاء، مطلق العنانی اور جمہوریت کی طویل کشمکش مختلف زمانوں کے جمہوری نظامات اور اسلامی و مغربی جمہوری افکار کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے۔

صفحات ۵۰۶ ۔ قیمت ۸/- روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور